افکار بشری کی آزادی میں قرآن کا حصہ

شیخ عبدالعزیز شاویش مرحوم کے خطبات

حصہ اول

اب چار پانچ سال قبل مصر کے مشہور فاضل شیخ عبدالعزیز شاویش مرحوم نے مدرسہ دارالعلوم قاہرہ میں عنوان مذکور پر چار خطبات دیے تھے جن کا ترجمہ صفحات ذیل میں درج کیا جاتا ہے ضروری نہیں ہے کہ شیخ کے تمام خیالات سے ہم متفق ہوں لیکن مجموعی حیثیت سے ہم خیال کرتے ہیں کہ شیخ نے جس پہلو سے قرآن حکیم پر نظر ڈالی ہے اس پہلو پر بہت کم لوگوں نے توجہ کی ہے۔ (ایڈیٹر)

حضرات!

غالباً یہ زیادہ بہتر ہوگا کہ فکر بشری کی تحریک تحریر (آزادی) میں قرآن مجید کے اثر کو بیان کرنے سے پہلے میں آپ کے سامنے ایک مختصر تاریخی بیان پیش کروں جس سے معلوم ہو کہ ظہور اسلام سے پہلے دنیا کی بڑی بڑی قومیں کن انقلابات سے گذری ہیں اور اس کے بعد کئی صدیوں تک قوموں کی عقلوں میں کس قسم کا مد و جزر اور آزادی و غلامی کا الٹ پھیر رہا ہے، یہ بیان ہم کو اس بات کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کرنے میں مدد دیگا کہ قرآن نے عقل انسانی کو اس کا پورا پورا حصہ دلانے اور اسے اس مقام تک پہنچانے میں کس قدر حصہ لیا ہے جس تک انسان کے خالق نے اول آفرینش میں اس کا پہنچنا مقدر فرمایا تھا۔

سلطنت رومیہ (Roman Empire) کے عام سیاسی قانون کی بنیاد ادیان و عقائد اور افکار کی کھلی ہوئی آزادی پر تھی، اور وہاں یہ حالت برابر قائم رہی، تا آنکہ مسیحی مذہب یورپ میں داخل ہوا، اور اس کے ساتھ ہی روک ٹوک اور قیود اور بندشوں کا وہ دور شروع ہوا جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

قدیم زمانہ میں بعض شعراء یونان اور مذہبی پیشواؤں کے اثر سے لوگ خرافات اور رسوم اور تنگ نظری وتنگ دلی پیدا کرنے والے افسانوں کے جال میں پھنسے ہوئے تھے ان سے افکار کو آزاد کرانے میں سب سے زیادہ جن لوگوں نے حصہ لیا ان میں ہرقلیتوس (Heracleitus) اور دیموقریط (Demoeritus) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان دونوں نے مادہ طبیعیہ کی تحقیق وتفتیش کے بعد نفس بشری کے احوال اور سیاسی مسائل سے بحث کی، اور اپنی تمام کوششوں اور کاوشوں میں ایک ہی چیز کو اصل الاصول قرار دیا یعنی ہر شئے کو عقل اور فکر کی کسوٹی سے پرکھنا یہی طریقہ انکساغورس (Anaxagoras) کا بھی تھا۔ اس نے لوگوں کو بتایا کہ یہ سورج جس کی تم صبح شام پوجا کیا کرتے ہو، یہ محض آگ کا ایک تودہ ہے، خدا نہیں ہے کہ اس کی پرستش کی جائے انسانی عقل کو اوہام کی بندشوں سے آزاد کرانے میں ان فلاسفہ نے جو کچھ کیا، اسی نے ان علماء تربیت کیلئے راستہ صاف کی جو صوفیہ یا سفسطائیہ (Sophists) کے نام سے موسوم ہیں، جو پانچویں صدی قبل مسیح میں ظاہر ہوئے اور جنہوں نے قرن مذکور کے نصف ثانی میں اخلاق و سیاست کے نقطۂ نظر سے حیات اجتماعی کے قواعد و اصول وضع کئے اور خطا و صواب، عقل اور قوانین منطق و خطابت وغیرہ سے بحث کی۔ لیکن یہ سب باتیں ایک بہت ہی قلیل طبقہ علماء اور مفکرین کے طبقہ سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ رہے عوام، تو وہ ہر جگہ خرافات اور باطل عقاید کے دام میں اسیر تھے البتہ اس عہد میں ایتھنز (Athens) جس آزادی فکر اور سیاسی مسائل میں بحث و کلام کی حریت سے بہرہ مند تھا، اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا خصوصاً ایتھنز کے زعیم حریت پریکل (Pericles) کے عہد میں کہ وہ آزاد مفکرین کا بڑا حامی تھا، اور اسی کی طاقت نے ایتھنز کے دیوتاؤں سے انکار کرنے والے فلسفی انکساغورس کو قانون کی گرفت سے بچایا اس زمانے کے واقعات و حوادث کے مطالعہ سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ ادیان کے خلاف خروج کرنے والا شاذ ہی کبھی بچ سکتا تھا اور اس مضمون میں جو کتاب شایع ہوتی تھی، اس کے نسخے جمع کر کے جلا ڈالے جاتے تھے اور ان کی فروخت کو ممنوع قرار دیا جاتا تھا لیکن بے دین منطقیوں (Rationalists

کے خلاف جو منظم شورشیں اور باقاعدہ سختیاں پہلے ہوتی تھیں وہ پانچویں صدی عیسوی کے اواخر میں کم ہونے لگیں، جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اب ان لوگوں کی تعداد بڑھ گئی تھی اور ان کا گروہ پھیلتا جا رہا تھا۔ یونانیوں اور رومیوں کے ہاں ان کی انتہائی علمی تمدنی اور مادی ترقی کے زمانہ میں جو قضایا مسلّم تھے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ مطلقاً مذہب عوام کے لئے نافع اور ضروری ہے جو لوگ حقیقت میں مذہب کے قائل نہ تھے وہ بھی سیاست عامہ کے ایک رکن کی حیثیت سے اس کے فائدے کے ضرور قائل تھے۔ کیونکہ ان کے فلاسفہ اکثر اس قسم کے عقائد اور نظریات کی اشاعت کا اقدام کر بیٹھتے تھے جو حیات اجتماعی میں اضطراب اور برہمی پیدا کرنے والے ہوتے تھے۔ یونانیوں میں سے جن لوگوں کا قدم اس میدان میں سب سے آگے تھا، ان میں ایک سقراط ہے، جو بجا طور پر ان علمائے تربیت میں سب سے زیادہ جلیل القدر سمجھا جاتا ہے۔ جس چیز نے اس کو ممتاز اور یکتائے روزگار بنا دیا تھا۔ وہ یہ تھی کہ وہ نکتہ چینی اور مناقشہ کے طریق میں نہایت مضبوط تھا اور جو لوگ اس سے گفتگو کرتے یا اس کا کلام سنتے، ان کو اپنے زور تقریر سے اس نقطہ پر کھینچ لاتا تھا کہ معروف و مقبول عام عقائد کو بغیر جانچے پرکھے تسلیم نہ کریں، ان کو عقل و فکر کی کسوٹی پر کس کر دیکھیں رسوم و تقالید کی بند شوں میں بند ہے نہ رہیں عوام کی خواہشوں اور رغبتوں سے بے پروا ہو جائیں اور ہر بحث و تحقیق کے لئے اپنے سینے کو کشادہ کرلیں۔ سقراط نے علم کی اشاعت اور تلاش حق اور فکر صحیح کے طریقوں کی جانب اپنے عہد کے نوجوانوں کی رہنمائی کے لئے یہ طریقہ اس لئے اختیار کیا تھا کہ پانچویں صدی قبل مسیح کے وسط میں یونان ایک ایسی فکری حرکت کا میدان بنا ہوا تھا جس کی ابتدا کرنے والے یا تو پیٹ کا دھندا چاہتے تھے یا شہرت و نام وری کے طالب تھے۔ ان لوگوں نے اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لئے جدل اور تشکیک کے طریقوں میں غلو کی انتہا کر دی تھی، اور ان کو اس کی کچھ پروا نہ رہی تھی کہ ان طریقوں سے لوگ کس قدر گمراہ ہوں گے اور اس کے کیسے برے نتائج ظاہر ہوں گے ان لوگوں نے حق اور باطل، فضیلت اور رذیلت کو ایسا گڈمڈ اور خلط ملط کیا کہ لوگوں کے لئے صحیح اور غلط میں تمیز کرنا مشکل ہو گیا، اور علم صحیح کے نشانات و حدود نگاہوں سے چھپ گئے انھوں نے

فکر و نظر کے شعبوں میں سے کوئی شعبہ اور معرفت کے میدانوں میں سے کوئی میدان نہ چھوڑا جس کے اساس و ارکان میں تشکیک کے تیشے نہ چلائے ہوں نہ اس غرض سے کہ کسی علمی فائدے تک پہنچیں، یا صحیح نتائج حاصل کریں، بلکہ محض بھٹکنے اور بھٹکانے کے لئے محض جاہل بننے اور بنانے کے لئے۔

پس جب سقراط عقل رزیں رائے سدید اور علم صحیح لے کر آیا تو اس کے لئے بجز اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ لوگوں سے ان کی عقل کے مطابق کلام کرے اور انکی رہنمائی کے لئے اسی راستہ پر چلے جن پر دوسرے لوگ ان کو گمراہ کرنے اور ان کو بھٹکانے کے لئے چلتے تھے اگر وہ انکی تعلیم و ارشاد میں ان راہوں سے الگ کوئی راہ اختیار کرتا جن کے وہ لوگ گرویدہ ہو چکے تھے، تو وہ نہ ان کو اپنے طریقہ کی طرف کھینچ سکتا اور نہ اپنے مقاصد میں کوئی کامیابی حاصل کر سکتا سقراط کے زمانہ تک تربیت عالیہ کو یونان کے سیاسیین اور مفکرین کے مقاصد میں شامل ہونے کا شرف حاصل نہ ہوا تھا، باوجودیکہ ایتھنز اس عہد میں اپنی جمہوریت اور رواداری اور آزاد خیالی کے لئے تمام دنیا میں مشہور نہ تھا مگر تاریخ ہمکو حریت فکر کی طرف دعوت دینے والوں اور عقل سے فیصلہ چاہنے والوں کے خلاف اہل ایتھنز کے ظلم و ستم کی وہ وہ داستانیں سناتی ہے جن کے باور کرنے سے وہم انکار کرتا ہے سقراط مناظرہ و مجادلہ اور تشکیک و نقد کے فن میں بڑے درجہ کا ماہر تھا، اور لوگوں کے رسوم و عقائد کی پابندیوں سے اس کی آزادی مشہور تھی اس کے مقابلے میں یونانیوں کے اندر ایک ایسی روح کام کر رہی تھی جو جدید عقلی زندگی کی دشمن تھی، وہ فلاسفہ اور ان کے سردار سقراط سے جنگ کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے اور انھوں نے جھوٹے قصے گھڑ کر ان کو بدنام کیا، ان کا مذاق اڑایا سقراط جیسے شخص کو زندیق، بدعمل اور گمراہی کی طرف بلانے والا مشہور کیا، یہاں تک کہ یونانی قوم اس کے خلاف بھڑک اٹھی اور اس کو ملحد اور نوجوانوں کے عقائد خراب کرنے والا قرار دیکر ۲۹۹ سنہ قبل مسیح میں قتل کر دیا اس پر نوجوانوں کے عقائد خراب کرنے کا الزام تھا۔ اس کو رد کرتے ہوئے اس نے دو باتیں پیش کی تھیں:۔

۱۔ ہر شخص کا فرض ہے کہ جب وہ دیکھے کہ اس پر ظلم کیا جا رہا ہے تو اس کا مقابلہ کرے، خواہ نتیجہ مخالف ہو یا موافق اور بیجا ہے وہ ظلم کرنے والا کوئی صاحب اثر آدمی ہو، یا کوئی محکمہ ہو۔

۲- اپنی بات سے ہرگز نہ ٹلے کیونکہ آزاد مباحثہ میں بڑی مصلحت ہے اور یہی چیز علم صحیح کی ضامن ہے۔ اس کے ۷۰ برس بعد ارسطو کو بھی اسی انجام کے خوف سے ایتھنز چھوڑنا پڑا، کیونکہ وہاں اس کو بھی ملحد شمار کیا جانے لگا تھا۔

سقراط کے سب سے زیادہ جلیل القدر شاگرد افلاطون نے ایک نئی ضرب لگائی جس نے حریت فکر و مباحثہ کی جانب پیشقدمی کو رجعت سے بدل دیا وہ اپنی مثالی ریاست (ideal state) میں لوگوں کو ایک خاص دین قبول کرنے پر مجبور کرتا ہے، جس کا خاکہ خود اس نے پیش کیا ہی جو کوئی اس دین پر ایمان نہ لائے افلاطون اس کو قتل اور قید کی سزا دینا چاہتا ہی۔ وہ گفتگو اور مباحثہ کی آزادی کو بھی سزاؤں سے روکتا ہے جو اس نے اپنی کتاب میں تجویز کی ہیں۔

سقراط کی تعلیمات ایک ایسا سرچشمہ تھیں جس سے فلسفہ کے متعدد مذاہب رونما ہوئے اور فلاسفہ کا ایک ممتاز گروہ پیدا ہوا جن میں افلاطون اور ارسطو اور رواقیہ (Stoics) وغیرہ شامل ہیں جن کے مذاہب تیسری صدی قبل مسیح سے بلاد یونان کے اطراف میں پھیلنے شروع ہوئے، اور جنھوں نے عقلی زندگی کے دروازے کھول دیئے اور اہل یونان میں فکر و تدبر کی قابلیت پیدا کی۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابل بیان ہی کہ گو ابیقورس (Epicurus) اس وجود میں تدبیر و تصرف کرنے والی خدائی حکومت کا منکر تھا، اور اس کی نظر مادہ اور مادیات کی حدود سے آگے نہ بڑھ سکی تھی مگر اس کے باوجود وہ حدت فکر کی دشوار گذار گھاٹیوں سے اس حیرتناک سرعت کے ساتھ گذرا کہ سوتی ہوئی عقلیں چونک پڑیں اور صدیوں تک زمانہ اس کے اثر کو نہ مٹا سکا حتیٰ کہ ایک رومی شاعر کو تو اس کے فلسفہ میں وحی و الہام کا جلوہ نظر آیا جس کو اس نے اپنے قصیدے "طبیعۃ الدنیا" نامی میں بیان کیا ہی۔

انسانی عقل کی آزادی میں رواقی فلسفہ کا بھی کچھ کم حصہ نہ تھا بلکہ درحقیقت اس مذہب نے ان قوانین اجتماعیہ کو ایک منظم اور مفصل طریق پر پیش کیا جن کا سقراط نے کچھ بھی ذکر نہ کیا تھا۔ رواقی فلسفہ نے رومی قوانین پر

خاص اثر کیا، کیونکہ رومی سلطنت کے قانون مدنی کی بنیاد تمام ادیان کی کھلی ہوئی آزادی اور اظہار رائے کی پوری حریت پر تھی، جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

حضرات!

رومی سلطنت اسی آزادی فکر اور حریت دینی کے قانون پر چل رہی تھی کہ مسیحی مذہب یورپ پہنچا، اور رومی قوم نے اپنی صنم پرستی کی حفاظت کیلئے مذہبی آزادی کے اصول کو خیرباد کہدیا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ رومی اس مذہب کو یہودیت کی ایک شاخ سمجھتے تھے، اور یہودیت بالطبع رومیوں کے ذہنی عقاید کی مخالف تھی اور رومیوں کو ایک آن نہ بھاتی تھی، یہودیت اور اس کے شبہ میں مسیحیت سے رومیوں کی شدید نفرت و بغض کا نتیجہ یہ ہوا کہ تراجان (Trajan) نے ان لوگوں کے قتل کا حکم دیدیا جو دین نصرانی کے پیرو تھے اگرچہ اس کے ساتھ ایسی قیود بھی عاید کردیں کہ حد سے زیادہ قتل عام نہ ہونے پائے لیکن بعد میں قیصر ڈیوکلیتیان (Diocletian) نے حکومت کے مذہب کی تائید کرنے کا عزم کرلیا اور پوری سنگدلی اور قساوت کے ساتھ مسیحیوں کا قتل عام کرایا۔ درحقیقت جس چیز نے اس فرمانروا کو ان جرائم پر آمادہ کیا وہ یہ تھی کہ مسیحیت رومیوں کی اس عبادت کی مخالف تھی جس کا مرکز رومن ایمپائر کا تخت تھا بخلاف اس کے رومی فرمانروا اس کو ضروری سمجھتے تھے کہ قومیں ان کو اپنی عبادت کے لئے مخصوص کرلیں تاکہ ان کی وحدت قومی باقی رہے اور اس تخت سے انکا خالص تعلق قائم رہے جو پوری سلطنت کا مرکز ہے۔

لیکن قسطنطین اعظم کے نصرانیت میں داخل ہوتے ہی نقشہ بدل گیا۔ اس سے پہلے دو صدیوں تک تو مسیحیت کے پیشوا یہ اعلان کرتے رہے تھے کہ مذہبی رواداری واجب ہے اور عقاید وہ چیز نہیں ہیں جو زبردستی انسان کے سر تھوپی جاسکتی ہو لیکن قسطنطین کا مسیحیت میں داخل ہونا تھا کہ سرے سے یہ سب اصول پلٹ گئے، اب حکام اور فرمانروا بیشتر سیاسی اغراض کے لئے، اور عوام کے مختلف گروہ آپس کے مذہبی اختلافات کی بنا پر فتنوں کے شعلے بھڑکانے لگے جگہ جگہ ہولناک قتل عام برپا کرنے لگے، دنیا سے امن و سلامتی رخصت ہوگئی دلوں سے راحت و اطمینان کی متاع چھن گئی۔ ان کی تعلیم یہ تھی کہ نجات مسیحیت قبول کئے بغیر ہو نہیں سکتی، اور جو اس کو قبول نہ کرے اس کو کوئی فدیہ نہ عذاب جہنم سے

بچا سکتا ہے اور عذاب آخرت سے چاہے اس میں کیسے ہی فضائل ہوں اور اس نے کیسے ہی نیک کام کئے ہوں۔ وہ کہتے تھے کہ اگر بچہ بپتسمہ لئے بغیر مر جائے تو وہ آخرت میں ہمیشہ ہمیشہ پیٹ کے بل دوزخ کی زمین پر گھسٹتا رہیگا۔ ان کے مقدس ترین آدمیوں میں سے ایک سینٹ اگسٹائن (St. Augustine متوفی سنہ ۴۳۰ء نے نصرانیت قبول نہ کرنیوالوں پر جبر و ظلم کرنے کے لئے ایک نظام مقرر کیا تھا جو اس کے بعد بارہویں صدی تک مسلسل چلتا رہا جب کبھی نصاریٰ کے درمیان کوئی بدعت رونما ہوتی یا کوئی ایسا عقیدہ نکلتا جو چرچ کے نفوذ و اثر کو کم کرنے والا ہوتا، تو اس عقیدہ کے پیرووں پر پادریوں کی طرف سے سختیاں کی جاتیں اور ان کو سزائیں دینے میں انتہائی مبالغہ کیا جاتا تھا، پوپ انوسنٹ سوم (Innocent نے کونٹ طولوز کو حکم دیا کہ اپنی رعایا میں سے اس گروہ کا استیصال کردے جس پر مذہبی بدعت کا الزام تھا، اور جب کونٹ نے اس کا حکم نہ مانا تو پوپ نے اس کے خلاف صلیبی جہاد کیا جس میں اس کی قوم فنا ہوتے ہوتے رہ گئی، کونٹ کی املاک ضبط کی گئیں اس کی شوکت مٹا دی گئی، اور پوپ نے اس سے اس وقت تک صلح نہ کی جب تک کونٹ نے اپنے ملک سے اس مذہب کا کلی استیصال کر دینے کی شرط نہ مانی۔

اس طرح سنہ ۱۲۳۳ء میں ملحدین کی تحقیقات کے لئے نظام تفتیش (Inquisition) قائم کیا گیا اس کی تنظیم پوپ انوسینٹ چہارم کے عہد میں سنہ ۱۲۵۲ء میں مکمل ہوئی۔ تمام نصرانی ممالک میں سے پھیلا یا گیا پادریوں کو اس پر مفتش مقرر کیا گیا۔ پاپاؤں کی جانب سے ان کو مطلق اختیارات عطا کئے گئے جن کے استعمال میں ان سے کوئی باز پرس نہ کی جاتی تھی۔ اور اس کے ساتھ ہی نصرانی سلاطین نے بھی ملحدوں کو سزائیں دینے کے لئے سخت ظالمانہ قوانین مقرر کئے۔ باوجودیکہ فریڈرک دوم (Frederick نہایت آزاد خیال شخص تھا لیکن اس نے بھی ایک حکم صادر کیا کہ جو کوئی نصرانیت میں کوئی بدعت نکالے، وہ دین سے خارج سمجھا جائے، اگر توبہ نہ کرے تو جلا دیا جائے اگر توبہ کرے تو قید کیا جائے اور اگر توبہ سے پھر جائے تو قتل کر دیا جائے اور بہر صورت ان سب کی املاک ضبط کی جائیں اور ان کے گھر ڈھا دے جائیں، ان کے بچے اور عورتیں تک رحم کے مستحق نہیں ہیں، اگر وہ ملحدین و مبتدعین کی مخبری نہ کریں (چاہے وہ ان کے باپ ہی کیوں نہ ہوں) تو ان کے ساتھ بھی وہی سختی کا برتاؤ کیا جائے۔ فریڈرک نے

الحاد اور بدعت کے لئے سولی کی سزا مقرر کی تھی یہ حکم اٹلی اور جرمنی میں ۵ اسال تک (سنہ ۱۲۲۰ء سے سنہ ۱۲۳۵ء) جاری رہا
پھر نظام تفتیش تمام مغربی یورپ میں پھیل گیا ہنری چہارم و پنجم کے زمانہ میں انگلستان میں بھی ملحد
کی سزا سولی سے دی جاتی تھی، یہ قانون سنہ ۱۴۰۱ء میں جاری ہوا، سنہ ۱۵۳۳ء میں منسوخ ہوا پھر دوبارہ ملکہ میری کے
عہد میں جاری کیا گیا اور سنہ ۱۶۷۷ء میں آخری مرتبہ منسوخ ہوا لیکن مسلمانوں اور یہودیوں کے خلاف بدترین وحشیانہ
طریقوں کے ساتھ اس قانون کو برابر جاری رکھا گیا، اور اس کی قانونیت انیسویں صدی میں منسوخ کی گئی اس
دوران میں یہ قانون ان مسلمانوں اور یہودیوں پر نافذ کیا جاتا تھا جن پر ارتداد کا الزام ہوتا تھا مختصر یہ کہ
نظام تفتیش نے یہ قاعدہ کلیہ مقرر کر رکھا تھا کہ "سو بے گناہوں کا قتل کیا جانا اس سے بہتر ہے کہ ایک شخص
الحاد کرے" اس قاعدہ کے مطابق وہ کم سے کم شبہ کی بنا پر بھی لوگوں کو قتل کرتے اور جلا ڈالتے تھے، اور کسی کو
اپنی طرف سے مدافعت پیش کرنے کا حق نہ تھا، اور نہ کوئی محکمہ کسی حال میں تردیدی شہادت قبول کرتا تھا،
چنانچہ پوپ انوسنٹ ہشتم نے سنہ ۱۴۸۴ء میں اعلان شائع کیا کہ طاعون اور آندھیوں کا آنا دراصل جادوگروں کے عمل
کا نتیجہ ہے، لہذا ہر جگہ ان کو تلاش کرو اور جہاں ملیں بری طرح مارو اور قتل کرو۔ یہ حکم خصوصیت کے ساتھ انگلینڈ
اور اسکاٹ لینڈ میں زیادہ زور کے ساتھ نافذ کیا گیا۔

بارھویں صدی کے آخر میں ایک دوسری دنیا سے اہل یورپ کی عقلوں کے لئے ایک نئی روشنی پہنچی تاکہ انہیں ان بندشوں
اور بندھنوں سے آزاد کرائے جن میں وہ جکڑی ہوئی تھیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مغربی یورپ میں اہل عرب کے واسطہ سے فلسفہ ارسطو کی
تعلیم پہنچ رہی تھی، یورپ والوں کی عقلوں کو آزاد کرانے میں ابن رشد اور اس جیسے دوسرے فلاسفۂ اسلام کا بڑا حصہ ہے اور انکی تعلیمات
کے اثر کو مٹانے اور ان کا مقابلہ کرنے میں پاپاؤں کا حصہ بھی کچھ کم نہیں ہے۔ پوپ یوحنا یازدہم ابن رشد کی
تعلیمات کی سخت برائی کرتا تھا۔ اور اس کے وجود اور اسکی اشاعت کو حد درجہ مضر بتاتا تھا، جنوبی اٹلی
میں سینٹ طامس اکون نے سنہ ۱۲۷۳ء میں ارسطو اور مسلمانوں کے فلسفہ کے مقابل کنیسہ کیلئے ایک فلسفہ ایجاد کیا جس پر آج
اتبک رومن کیتھولک چرچ قائم ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کے فلسفہ میں انسانی عقل کو کوئی جائے قرار نہیں ملتی

بلکہ وہ اسے ایک تنکے کی طرح ہوا میں اس طرح اڑائے لئے پھرتا ہے کہ کہیں وہ ٹھیر نہیں سکتا۔

مورخین کا اس پر اجماع ہے کہ حرکت فکری اور نہضت علمی یورپ میں بارہویں صدی عیسوی کے قریب دو راستوں سے داخل ہوئی: ایک تصادم جو دو صدیوں تک صلیبی لڑائیوں کے زمانے میں فرنگی اقوام اور اسلامی مشرق کے درمیان ہوتا رہا، دوسرے وہ معاہد علمیہ جو عربوں نے اندلس، اٹلی اور صقلیہ میں قائم کئے۔ اور محقق مورخین یہ بھی ثابت کر چکے ہیں کہ یورپ میں جن لوگوں سے نہضت علمیہ کی تاریخ شروع ہوتی ہے، مثلاً راجر بیکن وغیرہ، وہ عربی زبان جانتے تھے اور لاطینی سے بھی واقف تھے جس میں قریب قریب فن کے متعلق عربوں کے علوم و مباحث منتقل ہو رہے تھے جہاں کہیں ان لوگوں نے ایجاد و ابداع کے شرف کا دعویٰ کیا ہے، یا یہ شرف ان کی طرف منسوب کیا گیا ہے، اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ انہوں نے عمداً وہ مصادر چھپائے ہیں جہاں سے مسائل انہوں نے اخذ کئے اور اپنے بنا کر پیش کر دئے۔ ائمۂ تاریخ نے ثابت کیا ہے کہ انگریزی راہب راجر بیکن نے جس کی طرف اہل فرنگ عدسات و مناظر و مرایا (Optics) میں صنعت کا شرف منسوب کرتے ہیں، یہ مسائل ابن الہیثم سے اخذ کئے تھے جو طبیعیات اور خصوصاً نور اور بصریات کے مسائل میں اہم مباحث لکھ گیا ہے پس وہ اہل قرآن ہی تھے جن کے ساتھ ربط و تعلق نے اہل یورپ کی آنکھیں کھولیں ان کی بصیرت پر سے جہالت کے پردے ہٹائے، اور صدیوں کی چھائی ہوئی تاریکی سے ان کو نکالا اگر مغرب کے باشندے اس وقت ہر حیثیت سے اسی مرتبۂ عقلی پر ہوتے جس پر اہل قرآن تھے، تو عربی تمدن اور اسلامی حریت فکر سے رابطہ قائم ہونے کے بعد انکی فکری بیداری میں ذرا سی بھی تاخیر نہ ہوتی۔ لیکن اس زمانے میں مذہبی پیشواؤں کی گرفت ایسی مضبوط تھی اور مسیحی دنیا کی عقلیں کچھ اس طرح انکی غلامی میں جکڑی ہوئی تھیں کہ اسلامی تمدن کے اثرات پوری قوت کے ساتھ آگے نہ بڑھ سکے جو فلسفہ ان کے ہاں پہنچا اس کا رخ مذہبی پیشواؤں نے دینی مباحث کی طرف پھیر دیا، اور کنیسہ کی چار دیواری میں اس کو مقید کر دیا اور اس طرح اس کی عنایت طبیعی تک نہ پہنچنے دیا۔

سنہ ۵۲۹ء میں کیتھولک چرچ کی جانب سے اس مضمون کا جو فرمان جاری کیا گیا تھا، کہ تمام مجادلات

سے پرہیز کیا جائے، اور تورات و انجیل کی تفسیر بجز اس طریقہ کے کسی دوسرے طریقہ سے نہ کی جائے جو کنیسہ نے مقرر کردیا ہے، اس نے نصرانی قوموں میں عام ناراضی پھیلادی تھی اور یہ حکم من جملہ ان اسباب کے ایک بڑا سبب تھا جن کی بدولت پراٹسٹنٹ مذہب پیدا ہوا لیکن اس کے باوجود بھی پراٹسٹنٹ مذہب کے بانی لوتھر نے یہ قاعدہ مقرر کیا کہ حکومت قوم کو وہ عقیدہ اختیار کرنے پر مجبور کرسکتی ہے جسے وہ صحیح سمجھتی ہو، اور اسے حق ہے کہ ملحدوں اور اس عقیدہ کا انکار کرنے والوں کا استیصال کردے اسی قسم کے عقل کش قواعد و اصول تھے جنہوں نے ایک مدت تک حرکت فکریہ کو اپنی اصلی رفتار پر نہ چلنے دیا۔

آخرکار سولہویں صدی کے اواخر میں انگلستان کا فلسفی فرانسس بیکن ظاہر ہوا جس نے فلسفہ دینی پر زبردست حملے کئے اس کے عالیشان قصر کو دلائل کے تیشوں سے ڈھا کر رکھدیا۔ لوگوں کو عقلی آزادی کی طرف دعوت دی، اور علمی مسائل پر جدید اسالیب سے بحث کرنے کی بنا ڈالی علمی تحقیق کرنے والوں نے اس کی رہنمائی کو قبول کیا اور اس وقت سے تجدید علمی اور تجرید عقلی کا وہ دور شروع ہوا جس کی ثمرات سے اب تک مشرق و مغرب متمتع ہو رہے ہیں۔

آپ کو معلوم ہے کہ یورپ میں تاریخ فلک جدید کی ابتدا سنہ ۱۵۴۳ء سے ہوئی ہے یہ وہ زمانہ ہے جب کوپرنیکس Copernicus کی کتاب شائع ہوئی جس میں اس نے سورج کے گرد زمین کا گھومنا ثابت کیا تھا۔ اس کے بعد گیلیلیو (Galileo) نے اپنی دوربین کے ذریعہ سے مشتری کے چاند ثابت کئے اور یہ بھی ثابت کیا کہ زمین اپنے محور کے گرد گھومتی ہے پھر کنیسہ نے ان اکتشافات کا استقبال کس طرح کیا؟ فروری سنہ ۱۶۱۶ء میں [illegible] نے فیصلہ کیا کہ کوپرنیکس کا مذہب نہایت رکیک ہے، اسے مسیح کی وصیت کے مطابق بدعتی ٹھیرایا گیا، اور اٹھارہویں صدی عیسوی کے وسط تک روما نظام شمسی کی تعلیم سے محروم رکھا گیا اس مخالفت نے اٹلی میں علوم جدیدہ کی ترقی پر بہت برا اثر ڈالا، اسی طرح پوپ الکزینڈر نے سنہ ۱۵۰۱ء میں مطابع پر نگرانی قائم کردی تاکہ ایسے آزاد خیالات جن کو کنیسہ پسند نہ کرتا ہو شائع نہ ہونے پائیں، چاہے وہ ثابت شدہ علمی حقائق ہی کیوں نہ ہوں۔ فرانس میں

ہنری دوم نے اس شخص کے لیے قتل کی سزا مقرر کی تھی جو کوئی چیز بلا اجازت طبع کرے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یورپ کے کسی حصہ میں پریس کو انیسویں صدی سے پہلے آزادی نصیب نہیں ہوئی۔ یہی زمانہ ہے جس میں کنیسہ کا اقتدار ضعیف ہوا اور ملوک و امراء اور مذہبیت کا اقتدار بڑھا اور دستوری نظم و قوانین کا چرچا ہوا۔ فرانس میں جب جمہوری حکومت قائم ہوئی (سنہ ۱۷۹۲ء) تو پاپا کے اقتدار کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا گیا۔ اور اس کے ساتھ کنیسہ کے خلاف ایک زبردست حرکت شروع ہوئی۔ پیرس میں تمام معابد کو بلا استثناء بند کر دینے کا حکم دیدیا گیا۔ پھر جب روبس پیر (Robespierre) برسر حکومت آیا تو اس نے طے کیا کہ حکومت کا مذہب بزرگ و برتر کی عبادت ہو۔ اس کے تھوڑی مدت کے بعد ایک نیا دین ایجاد کیا گیا جس کا نام دین فطرت تھا۔ اور یہ اس صدی کے فلاسفہ اور شعراء مثلاً والٹیر (Voltaire) وغیرہ کا مذہب تھا۔ اس کے قواعد یہ تھے کہ خدا اور بقاء روح کا اعتقاد رکھو، اور اخوت، وانسانیت و رحمت کو شیوہ بناؤ، ورنہ اس دین کی دوسرے ادیان و مذاہب سے کشمکش برپا ہو جائے گی۔ اس نئے مذہب کو دین محبت الٰہی (The philanthropy) کے نام سے موسوم کیا گیا۔ مگر سنہ ۱۸۰۱ء میں نپولین نے اس مذہب کا تختہ الٹ دیا اور پاپائیت دوبارہ میدان میں آگئی۔ اس حرکت سے نپولین کا مقصد بجز اس کے کچھ نہ تھا کہ روحانی اقتدار سے فائدہ اٹھائے اور آیندہ کی لڑائیوں میں اس سے کام لے اور کیتھولک دنیا میں اپنی سلطنت وسیع کرے۔

سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں بہت سی مسیحی جماعتوں کا عقیدہ اس وجہ سے متزلزل ہو گیا کہ اس زمانہ میں یہ خیال عام طور پر پھیل گیا تھا کہ تورات اور انجیل کے بیانات میں تضاد اور اختلاف ہے جس کو قبول کرنے سے عقل انکار کرتی ہے۔ اس سے انکار وحی کا خیال پیدا ہو گیا اور جگہ جگہ علمی مناقشات ہونے لگے۔ انیسویں صدی میں قدیم رسوم و عقائد کے خلاف زیادہ منظم حملے ہوئے اور اُن میں سے اکثر کی جڑیں اکھاڑ پھینکی گئیں۔ اگرچہ اس زمانے کے علماء میں خود بھی باہم اختلاف تھا۔ بعض کھلم کھلا ان تقالید کے منکر تھے اور ان کو غیر معقول اور رکیک سمجھتے تھے، اور بعض اس حد تک نہیں پہونچے تھے۔ فرانسیسی عالم پاسکل (Pascal)

ان پر ایمان رکھتا تھا۔ انگریز فلسفی بیکن ظاہر میں لاہوتیت کا اعلان کرتا تھا۔ مگر دل میں الحاد چھپائے ہوئے تھا۔ دوسری طرف ڈیکارٹ (Rene Descartes) کوشش کررہا تھا کہ عقل اور کنیسہ میں موافقت پیدا کرے۔ اس زمانہ میں بسا اوقات ہم کو کنیسہ پر عقل کا غلبہ علانیہ نظر آتا ہے۔ مثلاً جادوگروں کے معاملہ میں یا تو ہم دیکھ رہے تھے کہ ۱۶۰۳ء میں جیمز اول انجیل کی آیت "تو جادوگر کو زندہ نہ چھوڑ" کے مطابق عمل کرکے ان مسکینوں سے نہایت سختی کے ساتھ پیش آرہا ہے یا دوسری طرف ہم کو یہ نظر آتا ہے کہ ہرٹفورڈ شائر کی ایک جادوگرنی کو جیوری سزائے قتل کی مستحق قرار دیتی ہے مگر جج ان کی بات کو قبول نہیں کرتا اور کنیسہ کی تعلیمات اور عام رسم کو نظرانداز کرکے اسے رہا کردیتا ہے۔ اگرچہ انگلستان میں ساحر کے قتل کا قانون ۱۷۳۵ء میں منسوخ ہوا لیکن اس کے بعد بھی ۱۷۵۲ء میں اسکاٹ لینڈ کی ایک عورت اس الزام میں زندہ جلائی گئی۔

قابل ذکر مذاہب میں سے ایک وہ ہے جس کی بنا ہالینڈ کے یہودی فلسفی اسپینوزا (Spinoza) نے رکھی۔ اس کا عقیدہ یہ تھا کہ عالم کا ایک خدا ہے جو اپنی ذات سے قائم ہے اور یہ کہ انسان اپنے ارادہ میں آزاد نہیں ہے اور علت اولیٰ یا علت العلل کا اعتقاد خرافات میں سے ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ وحدت الموجود یا وحدت الوجود کا اعتقاد رکھتا تھا۔ یہ ملحوظ خاطر رہے کہ یہ کلمہ سترہویں اور اٹھارویں صدی میں آزاد مفکرین کے رموز میں سے تھا کیونکہ اس سے عالم غضب اور تکفیر کا طوفان برپا ہوجاتا تھا اس کا اظہار صرف دقیق کتابوں ہی میں کیا جاسکتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس زمانہ میں جتنے لوگ آزاد خیال کہے جاسکتے تھے وہ سب کے سب آلہیین تھے، جو خدا پرستی کے تو قائل تھے مگر وحی کو نہ مانتے تھے۔

اسپینوزا کے معاصرین میں سے ایک لوک (Locke) ہے جس کی کتاب Essay on the Human under standing کا لب لباب یہ ہے کہ علم کلیتہً تجربات کا نتیجہ ہے۔ ہر حال میں اعتقاد کو حکم عقلی کے تابع ہونا چاہیئے جو چیز حکم عقلی کے خلاف ہو اس کے ماننے سے انکار کردو خواہ وہ وحی ہی کیوں نہ ہو جو علم صحیح نظر عقلی سے حاصل ہوتا ہے وہ وحی سے حاصل نہیں ہوتا۔ اس نے ایک کتاب نصرانیت کو عقل کے موافق بنانے کے لئے لکھی تھی اسی ڈھنگ پر اس کا

Phylosophical
معاصر بایل بھی چلا جس نے فرانس سے جلاوطن ہونے کے بعد ہالینڈ میں اپنی کتاب القاموس الفلسفی Dictionary مرتب کی۔ وہ کہتا ہے کہ اعتقاد کی فضیلت بس اس میں ہے کہ خدائے واحد کی قدرت اور اس کی فرمانروائی پر ایمان رکھو"۔ ایک اور موقع پر کہتا ہے کہ "الہیین کے لئے آرتھوڈوکس مذہب کے خدا کی صفات کو اس خدا کی صفات سے تطبیق دینا محال ہے جس کا وجود عقل سے ثابت ہوتا ہے" مگر جب آرتھوڈوکس لوگوں میں سے ایک فریق نے عقل کو حکم بنانا قبول کیا تو وہ گمراہ ہو گئے اور ان میں سے اکثر الحاد کے گڑھے میں جا پڑے۔ الہیین اور اسپینوزا اس امر میں متفق ہیں کہ آسمانی کتابوں کی تفسیر بھی اسی طرح ہونی چاہئے جس طرح دوسری کتابوں کی ہوتی ہے۔

سترہویں صدی کے آخر تک الہیین کے خیالات پوشیدہ رہے، پھر جب قوانین مطبوعات منسوخ ہو گئے تو انھوں نے کچھ کچھ اپنے خیالات کا اظہار شروع کیا۔ پوری آزادی اب بھی نہ تھی کیونکہ اب بھی چند مزاحمتیں باقی تھیں مثلاً مذہبی پیشواؤں کو حق تھا کہ جو کوئی مسیحی تعلیمات پر اعتراض کرے، یا ان کی تقالید کے خلاف رائے ظاہر کرے یا مسیح پر حرف گیری کرے اسے قید کر دیں۔ انگلستان کے لارڈ چیف جسٹس ہیل (Sir Mathew Hale) نے ۱۶۷۶ء میں قانون عام کی یہ تعبیر کی کہ ہر وہ عمل یا قول جو کنیسہ کی تعلیم کے خلاف ہو قانون عام کے خلاف سمجھا جائیگا کیونکہ نصرانیت انگریزی قانون عام کے ارکان میں ہے۔ ۱۶۹۸ء کے قانون عام میں یہ تصریح کی گئی کہ کسی نصرانی کے لئے کنیسہ کے اصول اور اس کی تعلیمات کے خلاف رائے ظاہر کرنا جائز نہیں ہے جو کوئی ایسا کریگا اس کو پہلی مرتبہ خدمت سے محرومی کی سزا دی جائیگی اور دوسری مرتبہ وہ عام مدنی حقوق سے محروم کر دیا جائیگا۔

اٹھارہویں صدی میں والٹیر اور روسو (Rousseau) نے آزادی فکر کی تحریک کا بیڑا اٹھایا موخر الذکر کی کتاب ایمل (Emile) علانیہ پیرس میں جلائی گئی اور حکومت نے اس کے مؤلف کی گرفتاری کا حکم صادر کیا، تمام یورپ میں فریڈریک شاہ پروشیا کے سوا کسی نے اس کو پناہ نہ دی۔ مگر وہاں بھی مذہبی پیشوا اس کے پیچھے پڑے رہے یہاں تک کہ اسے پروشیا سے بھی نکلنے پر مجبور کر دیا۔ روسو نے اپنی کتاب العقد الاجتماعی (Social Contract) میں جو اشتراکی نظریات بیان کئے ہیں ان کا حیات اجتماعی پر بڑا اثر ہوا ہے لیکن یہی کتاب اس نے ایمل

علانیہ جینوا میں جلائی گئی تھی،

۱۷۷۰ء میں جرمن بیرن دی ہولباخ (Holbach) کی کتاب نظام طبیعت (System of Nature) شایع ہوی جس میں اس نے خدا کے وجود اور بقائے روح سے انکار کیا تھا تو تمام فرانسیسی ناظرین گھبرا اٹھے تھے غرض اٹھارہویں صدی میں گو اس تحریک کی مخالفت پوری قوت پر تھی لیکن الحاد اور آزاد خیالی اس کے علی الرغم پھیلتی چلی گئی۔

انیسویں صدی تک بھی مذہب و آزاد خیالی میں کشمکش برپا رہی چنانچہ ۱۸۱۹ء میں جب کارلائل کی کتاب عصر العقل (The Age of Reason) شایع ہوی تو اسے تین سال کے لئے قید کی سزا دی گئی پھر اسی کتاب کی بدولت اس کی بیوی بیٹی اور بہت سے کتب فروشوں پر مقدمہ چلایا گیا۔

غرض اٹھارہویں صدی کے وسط تک اہل یورپ کی عقلیں قدیم تقالید کی بندشوں میں بری طرح جکڑی دی گئی تھیں اس زمانہ میں کیفیت یہ تھی کہ فریڈریک شاہ پروشیا کے باپ نے فیلسوف وولف (Wolfe) کو صرف اس جرم میں نکال دیا کہ اس نے کنفیوشس کے مذہب کی تعریف کی تھی گویا اس فرمانروا کی رائے میں کسی شخص کو نصرانیت کے سوا کسی مذہب کی تعریف کرنے کا حق ہی نہ تھا "مگر اسی باپ کے بیٹے نے اپنے ملک کو تمام ان لوگوں کے لئے جائے پناہ بنایا جو دوسرے ممالک میں حریت فکر کی بنا پر ظلم وستم کا تختہ مشق بنکر بھاگتے تھے" ۱۷۸۱ء میں کانٹ (Kant) نے اپنی کتاب نقد عقل صحیح (Critic of Pure Reason) لکھ کر دنیا بھر میں ہلچل برپا کر دی اس نے رائے ظاہر کی کہ اس کائنات سے خدا کے وجود پر استدلال کرنا غلط ہے۔ اور بقائے روح پر جتنے دلائل قائم کئے گئے ہیں باطل ہیں اور دعوی کیا کہ علم کے لئے تجربہ کے سوا کوئی مصدر نہیں ہے لیکن آخر میں اس نے ایک اور کتاب لکھی جو الہیت کے انداز میں تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ حیات اجتماعیہ میں اخلاق کے معیار کو برقرار رکھنا چاہتا تھا جس کے لئے بجز اس کے کوئی صورت نہ تھی کہ ایک روحانی رنگ اختیار کیا جائے اور آسمانی مصادر سے استناد کیا جائے۔